اُردو غزل کے تنقیدی مباحث

☆ نرگس بانو
Nargis Bano
☆☆ ڈاکٹر میمونہ سبحانی
Dr. Memoona Subhani

Abstract:

Critical Legality of Urdu Ghazal has been passed through many centuries of tough and resilient times. Urdu Ghazal has gathered only bunch of roses even it elapsed through and protected itself from dismal and gloom. Sir Syed Ahmed Khan made hard criticism on it but Azmat-ul-Allah Khan and Shabir Hussan expressed their complete disapproval and reprehension towards it. Still in such environment Ghazal not only proved itself but also showed much progress. Even modern poets can't put it under any harm. Even today it is a reknowned aspect of Urdu poetry and considered to be as favourit for past many centuries. It has such flexibility that it converts itself as per requirements of time. It can be easily predicted by taking into consideration about its bright past and successful present that Ghazal's future will be at it's Zenith.

اُردو غزل نے پچھلی کئی صدیاں دیکھی ہیں۔ سینکڑوں نشیب وفراز سے گزر کر رتبہ واعتبار کو پہنچی ہے۔ یہ غیر معمولی طبعی صلاحیت رکھنے کے سبب موافق و ناموافق ہر طرح کے حالات میں ثابت قدم رہی۔ حتیٰ کہ سر سید احمد خاں نے اپنی اصلاحی تحریک کے زیرِ اثر ''مقدمہ شعر وشاعری' میں اسے سخت طعن وتعریض کا نشانہ بنایا اور اس کے بعد دو پٹھان شاعروں عظمت اللہ خاں اور شبیر حسن خاں جوش نے اسے گردن زنی قرار دیا۔ یہ اُس وقت بھی اپنی تازہ کاری وسحر آفرینی کی بدولت نہ صرف بچ نکلی بلکہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک بار پھر اس طرح سامنے آئی کہ ترقی پسند تحریک کے نظم گو شعرا کا ہجوم بھی اس کا رستہ نہ روک سکا۔

☆ پی ایچ۔ڈی سکالر، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد
☆☆ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''یہ شعری روایت اردو کی جملہ شعری روایتوں میں سب سے قدیم، سب سے معتبر، سب سے آسان و مشکل، سب سے اہم و طاقتور، سب سے مقبول و محبوب، سب سے زیادہ ایمانی و اختصار پسند اور عظیم و قیع روایت ہے۔''(۱)

غزل اردو کی مقبول ترین صنف شعر ہے۔ اس کے لغوی معنی عورتوں یا عورتوں کے متعلق باتیں کرنا ہے۔ ہرن کے منہ سے بوقت خوف جو دردناک چیخ نکلتی ہے اسے بھی غزل کہتے ہیں۔ رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

''غزل وہ صنف شعر ہے جس میں حسن وعشق کی مختلف کیفیات کا بیاں ہو اور اس میں درد و سوز بہت نمایاں ہو۔''(۲)

غزل کے ہر شعر میں ایک مکمل مفہوم ادا ہوتا ہے اور ہر شعر اپنا اپنا الگ مفہوم دیتا ہے۔ پوری غزل ایک بحر میں ہوتی ہے۔ غزل کے لیے مطلع کا ہونا ضروری ہے۔ مطلع کے لیے دونوں مصرعے ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتے ہیں یا صرف ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ باقی اشعار کے صرف دوسرے مصرعوں میں قافیہ ہوتا ہے۔

اُردو غزل نے اپنی چہار صد سالہ تاریخ کے ہر دور میں چند ایسے بڑے شاعروں کو جنم دیا ہے کہ وہ اس کی مستقل سادگی و توانائی کی ضمانت بن گئے۔ دکنی دور میں شمالی ہند کے دور اول میں میر تقی میر دوسرے میں غالب اور بعد ازاں علامہ اقبال، حسرت موہانی اور فراق گورکھپوری کلاسیکی غزل کے ایسے طاقتور خوش رنگ عناصر کی حیثیت سے نمودار ہوئے کہ اردو شاعری کی پوری تاریخ پر قدیم و جدید رنگوں کا ایک خوب صورت سائبان تن گیا۔ اس سائبان میں جو ہستیاں بہت نمایاں ہوئیں۔ ان میں ولی دکنی، سراج اورنگ آبادی، درد، میر، ناسخ، مصحفی، آتش، غالب، ذوق، مومن، داغ، اقبال، حالی، شاد، حسرت، فانی، جگر، یگانہ اور فراق وغیرہ بہت اہم ہیں۔ غزل کے بارے میں پروفیسر آل احمد سرور یوں رقم طراز ہیں:

''غزل کا آرٹ اشاروں کا آرٹ ہے اور یہ اشارے بڑی بڑی داستانوں کو اپنے اندر سموئے ہوتے ہیں۔''(۳)

غزل اردو شاعری کی مقبول ترین صنف ہے اور کئی سو سال سے ہماری روح رواں بنی ہوئی ہے۔ موجودہ دور میں غزل نے تنگنائے غزل کی حدود سے تجاوز کر کے اظہار کے لیے نئی راہیں متعین کر لی ہیں لیکن اس کے باوجود غزل کی ہر دلعزیزی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بہ حیثیت ایک صنف شعر کے اس میں کچھ ایسی قدرتی لچک ہے کہ ہر آنے والے دور میں خود کو ڈھال لیتی ہے۔ اختر انصاری لکھتے ہیں:

''اصطلاح شعرا میں غزل متفق الوزن اور متفق القوافی اشعار کے ایسے مجموعے کو کہتے ہیں جس میں کسی مسلسل مضمون کا پایا جانا ضروری نہیں۔ ہر شعر آزاد، قائم بالذات، خود مکتفی، معنی کے اعتبار سے اپنی جگہ پر مکمل اور ایک مستقل جداگانہ حیثیت کا مالک ہوتا ہے۔ شعر اول کے

دونوں مصرعے مقفّی ہوتے ہیں ۔ اسے مطلع کہتے ہیں، مطلع کے علاوہ دوسرے تمام اشعار میں پہلا مصرع قافیہ سے آزاد ہوتا ہے اور صرف مصرع ثانی میں قافیے کی پابندی ہوتی ہے۔''(۴)

غزل کی جو صنف ایران سے ہمارے ہاں پہنچی ایک زندہ صنف تھی اور زندگی کے امکانات سے بھرپور تھی۔ ہم نے نہ صرف اس زندگی کو برقرار رکھا۔ اس میں ذوق شعر اور احساس حسن کے ساتھ اضافہ بھی کیا۔ ہمارے ہاتھوں میں پہنچنے کے بعد غزل متعدد ادوار سے گزری ہے۔ اس نے میر، درد اور سودا کا زمانہ بھی دیکھا ہے۔ انشا، مصحفی اور جرأت کا دور بھی۔ ناسخ، شاہ نصیر اور ذوق کی فنی مہارت کا اظہار بھی اس میں پایا جاتا ہے اور آتش، غالب اور مومن کی گہر باریوں سے بھی سیراب و شاداب ہوتی ہے۔ غلام ربانی تاباں لکھتے ہیں:

''غزل رمز و ایما کی شاعری ہے۔ اس میں نہ تو نظم کا ظاہری تسلسل ہوتا ہے اور نہ بیانیہ انداز۔ اس کا اپنا ایک مزاج ہے، ایک مخصوص لہجہ ہے۔ ایک خاص آہنگ ہے اور بڑی حد تک دوسری اصناف سے مختلف انداز بیان۔ اس کے ڈانڈے آرٹ کے اُس قبیل سے ملتے ہیں جہاں فن کار چند خطوط کے ذریعے تصویر مکمل کر دیتا ہے۔''(۵)

اُردو متغزّلین کے سامنے فارسی غزل کی روایات کے رنگا رنگ نمونے موجود تھے۔ انھوں نے ان روایات کو اردو روایات میں سمویا اور اپنی تہذیب و معاشرت کے نقوش اجاگر کیے۔ سلام سندیلوی لکھتے ہیں:

''اردو ادب میں داخلی شاعری کی بہترین مثال غزل ہے جو شاعری کی دروں بینی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ غزل میں شاعر مختلف واردات قلبیہ نظم کرتا ہے۔ خوشی، غم، وصل، ہجر کی کیفیات دکھاتا ہے۔ حسن محبوب دیکھ کر اس کے دل میں احساسات پیدا ہوتے ہیں۔ اس کی سچی تصویریں کھینچتا ہے۔ اس کے علاوہ اخلاق، تصوف اور فلسفے کی گتھیاں سلجھاتا ہے لیکن یہ ساری گفتگو وہ رمز و کنایہ میں کرتا ہے۔ اشارات اور رمزیت غزل کی جان ہیں۔ یہی چیز غزل کی شاعری میں تاثیر پیدا کرتی ہے۔''(۶)

دکن میں ولی اپنا مقام بنا چکے تھے۔ شروع میں شمالی ہند میں ایہام گوئی نے جنم لیا۔ بعد میں میر، درد اور سودا کے ہاتھوں غزل کا آغاز ہوا۔ اسے غزل کا سنہری دور کہا جاتا ہے۔ اردو غزل کا پہلا صاحب دیوان شاعر قلی قلب شاہ ہے۔ اس کے علاوہ ابدال قطب شاہ، وجہی، نصرتی، سلطان اور مشتاق دکنی نے بھی غزل کہی لیکن دکن کی سرزمین پر پہلا سلیقہ مند شاعر ولی ہے۔ انھوں نے حسن و جمال کے ساتھ غزل میں موسیقی کا آہنگ بھی بھرا۔ ولی کہتے ہیں:

''اس رات اندھاری میں مت بھول پڑو تس سوں
ٹک پاؤ کی جھانجھر کی جھنکار سنائی جا''(۷)

ولی کے بعد غزل شمالی ہند پہنچی تو اس کو آبرو، آرزو، حاتم، مرزا مظہر جاناں، خواجہ میر درد، میر سوز، میر تقی میر، نظیرا کبرآبادی اور شاہ نصیر وغیرہ نے خوب فروغ دیا۔ میر وسودا کا دور تو اردو شاعری کا سنہرا دور کہلاتا ہے۔ میر نے غزل کو بامِ عروج تک پہنچایا۔ میر کا ایک شعر ہے:

''اب خرابہ ہوا جہاں آباد
ورنہ ہر قدم پہ یاں گھر تھا''(۸)

شاعر کے اردگرد ہونے والے واقعات، شاعر کے اندر ہونے والی تبدیلیوں سے بنتے اور بگڑتے ہیں۔ ان میں خارجی اور داخلی سطح پر تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ گویا شاعری ایک ردِعمل ہے جو گردوپیش اور خود شاعر کی ذات سے ابھرنے والے تخیلات سے وجود میں آتی ہے۔ ہر عہد کا شاعر اور ادیب اپنے اردگرد کے ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔ ہماری شاعری کی تاریخ جس میں شاعری پروان چڑھی اورنگ زیب کا دور انتہائی بدنظمی کا دور تھا۔ اس کے بعد مغلوں میں بہادر شاہ ظفر کے دربار سے کوئی نامور شاعر وابستہ نہ تھا۔ البتہ ۱۸۵۷ء تک کے دور کو اردو شاعری کے پھلنے پھولنے کا عہد تصور کیا جاتا ہے۔ اس دور میں شاعری کو ایک فن سمجھا جاتا تھا۔ ایک اہم موڑ وہ ہے جہاں لکھنوی اور دہلوی تہذیبیں ملتی نظر آتی ہیں۔ یہاں ایک طرف معاملہ بندی کی جھلک اور دوسری طرف غالب کی صورت میں کئی رنگ جھلکتے نظر آتے ہیں۔ غالب لکھتے ہیں:

''کی اس نے گرم سینہ اہل ہوس میں جا
آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے''(۹)

موجودہ اردو شاعری کی بنیاد مضبوط کرنے والے ولی دکنی نے شروع ہی سے اس کو ایک نیا لہجہ، نیا اسلوب اور نئی ترکیبیں مہیا کی تھیں۔ رام بابو سکسینہ کے نزدیک ولی کو اردو شاعری سے وہی نسبت ہے جو چاسر کو انگریزی سے اور رودکی کو فارسی سے۔ انھی کی بدولت اردو شاعری کی بنیاد پڑی۔ غزل کے ابتدائی دور میں میر، سودا اور درد نے لسانی عروضی تجربات کے ساتھ ساتھ اسلوب کے متنوع رنگ متعارف کرائے۔ اس دور میں غزل اپنے عروج پر تھی۔ اس دور کے سب سے بڑے غزل گو میر تقی میر کو ''خدائے سخن'' سے نوازا گیا۔ اُن کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اُنھوں نے غزل میں سوز و گداز پیدا کیا۔ ان کے اشعار ملاحظہ ہوں:

''مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا
ضبط تھا جب تئیں چاہت نہ ہوتی تھی ظاہر
اشک نے بہ کے میرے چہرے پہ طوفان کیا''(۱۰)

غزل ایک داخلی شاعری ہونے کے باوجود مجلسی چیز بن گئی۔ مشاعروں کی بدولت اس میں خارجی خصوصیات رواج پا گئیں۔ مصحفیؔ اور انشاؔ نے اس کو خوب فروغ دیا۔ اس سے شاعری میں وہ رنگ پیدا ہوا جس پر لکھنؤ کی چھاپ ملتی ہے۔ نورالحسن ہاشمی لکھتے ہیں:

''شاعری تو ایک داخلی چیز ہے لیکن مشاعروں نے اسے مجلسی بنا دیا۔ اسی لیے اس میں خارجی خصوصیات زیادہ ہو گئیں۔''(۱۱)

لکھنؤ میں غزل کی روایت میں صحت مند تبدیلیاں ہوئیں۔ لکھنؤ کے شعرا نے خارجیت کو ہوا دی اور سوز و گداز کی بجائے غزل کو عیش و عشرت سے آشنا کرایا۔ کوٹھے کی سیر کرائی۔ اس میں مبالغہ آرائی کو فروغ حاصل ہوا۔ اس دور میں آتش، مصحفی، جرأت اور ناسخ نے نت نئے تجربات کیے، مصحفی خوشبو اور رنگینی کے دلدادہ تھے اور ناسخ اصلاح زبان کے لیے کوشاں تھے۔ جرات معاملہ بندی اور جنسی پہلو کو ہوا دے رہے تھے تو حیدر علی آتش نے قلندرانہ انداز کے ساتھ ساتھ مردانگی اور بانکپن کا انداز عطا کیا۔ ان کے اشعار ملاحظہ ہوں:

''کعبہ و دیر میں ہے کس کے لیے دل جاتا
یار ملتا ہے تو پہلو ہی میں ہے مل جاتا
زخم کاری کی تری تیغ سے اللہ رے خوش
رقص کرتا ہوا دنیا سے ہے بسمل جاتا
اے صبا! تو ہی اُڑا کر رخ لیلیٰ دکھلا
دستِ مجنوں قیس تا پردہ محمل جاتا''(۱۲)

غالب اور مومن نے روایت کی بجائے جدت کو اہمیت دی۔ عذر کے بعد آزاد اور حالی جیسے قدآور شعرا نے اس کو نیا لہجہ عطا کیا۔ نئی شاعری کی داغ بیل ڈالی اور غزل کو قومی، ملکی، اخلاقی اور سماجی موضوعات کے اظہار کے قابل بنایا۔ بیسویں صدی میں حسرت موہانی اور ان کے ہم عصر شعرا فانی، بدایونی، اصغر گونڈوی اور یاس یگانہ نے اس کو مزید وسعت دی اور حزن و غم کے ساتھ ساتھ نشاطیہ پہلو کو بھی اہمیت دی۔ حسرت موہانی کے شعر ملاحظہ ہوں:

''رسم جفا کامیاب دیکھیے کب تک رہے
حب وطن مست خواب دیکھیے کب تک رہے
دل پہ رہا مدتوں غلبہ یاس و حراس
قبضہ حزم وحجاب دیکھیے کب تک رہے''(۱۳)

منفرد اسلوب اور فلسفیانہ گہرائی کی بدولت اردو غزل کو نئی جہت عطا کرنے والے علامہ محمد اقبال نے غالب کی طرح اس میں مذہب، سیاست، انقلابی شعور اور قوم کی اصلاح کو بڑی خوب صورتی سے سمویا۔ قوم کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لیے اسلاف کی عظمتیں بیان کیں۔ اس کے بعد غزل نے بالکل انوکھا انداز اپنایا۔ برصغیر میں انقلاب کی راہیں ہموار ہوئیں۔ فراق اور فیض احمد فیض جیسے شعرا نے اپنی غزلیات میں زندگی اور عشق کی ہم آہنگی کے ساتھ انقلاب اور حقیقت کا خوب صورت امتزاج کیا۔ جنگ

آزادی کے بعد شعرا نے واقعات کو مختلف زاویوں سے پیش کیا۔ سوز و گداز سے ساتھ ساتھ غزل میں ترقی پسندانہ انداز پر مبنی مضامین، بے اعتقادی، آزاد خیالی کے رویے، تنہائی، انفرادیت، پسند، خود غرضی اور سرمایہ پرستی کے رجحانات اس کا حصہ بنے اور مقصدیت کا احساس پیدا ہوا۔ غفور شاہ قاسم لکھتے ہیں:

''گزشتہ نصف صدی کے دوران پاکستان میں لکھی جانے والی غزل اپنے مزاج، اسلوب، لفظیات، استعارات، تشبیہات، علامات، موڈ مواد، فضا اور تناظر کے لحاظ سے منفرد پہچان کی حامل ہے۔ اس کی آب و ہوا ماحول اور موسم سب الگ الگ ذائقہ رکھتے ہیں۔''(۱۴)

تقسیم ہند سے پہلے جن شعرا نے اپنی شناخت قائم کی تھی، آزادی کے بعد ادبی دنیا میں روشن ستارے بن کر چمکے۔ ان شعرا میں احسان دانش، ظہیر کاشمیری، مجید امجد، میرا جی، حسرت موہانی، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، شیر افضل جعفری، مختار صدیقی، عارف عبدالمتین، یوسف ظفر، ناصر کاظمی، محمد دین تاثیر، صوفی تبسم، حفیظ جالندھری، قتیل شفائی، انجم رومانی، ابنِ انشا، ظفر اقبال، شہرت بخاری کے ناول قابلِ ذکر ہیں۔

اُردو اور فارسی ادبیات تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام اصنافِ سخن میں غزل ہی وہ واحد صنف ہے جس نے انقلاب مسلسل میں رہنے کے باوجود اپنے تشخص کو برقرار رکھا۔ مشکل سے مشکل امتحانوں کا مقابلہ کر کے سرخرو ہوئی۔ ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد لکھتے ہیں:

''اردو میں غزل کی اولین نمونہ ریختہ کی صورت میں تھی۔ یہ تکنیکی لباس اس کے قدِموزوں کے لیے مناسب نہ تھا۔ اس لیے اس نے ریختہ کی دشوار گزار گھاٹیوں کو عبور کر کے اور دکنی و گجروی کی تنگ ناؤں سے گزر کر اپنے لیے ایک ایسا دیدہ زیب اور نظر کشا لباس تیار کر لیا جس میں اس کا سراپا کامل صورت میں جلوہ گر ہوا۔ اس موڑ پر غزل نے اپنے مزاج کے مطابق موضوعات، اسالیب، ہیئت، لفظیات اور تکنیک کے لیے ایسے معیارات اور پیمانے وضع کیے جو اس کی شناخت کا سبب اور اس کی بقا کی ضمانت ٹھہرے۔''(۱۵)

لفظ غزل کے تحقیقی اور تفصیلی مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے موجودہ مفہوم کا ارتقا بہت تدریجی ہے۔ غزل ساری شاعری کی جان نہیں ہے اور نہ ہی اس خوش فہمی میں مبتلا ہوں کہ غزل شاعری کی آبرو ہے۔ یہ صحیح ہے۔ غزل ہماری شاعری کی ایک اہم اور قابل قدر صنف ہے اور ہر دور میں زندگی کے حقائق کی عکاسی اپنے مخصوص انداز میں کرتی ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

''غزل کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بلا کا لوچ ہے اور اس لوچ کے باعث وہ ہر طرح کے خیالات کو اپنے دامن میں سمو لینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔''(۱۶)

غزل فکر اور فن کے اشتراک کامل سے وجود پذیر ہوتی ہے۔ اس لیے غزل کی تشکیل میں صرف فکر کی کارفرمائی اہمیت کی حامل نہیں، فن بھی ہے۔ غزل کا فن جن عناصر سے تشکیل پاتا ہے۔ ان میں

تکنیک، ہیئت اور وزن اساسی پہلو کے حامل ہیں۔ قاسم جلال لکھتے ہیں:

''صدیوں سے اردو غزل کا سفر جاری ہے۔ یہ ہماری تہذیب کی آئینہ دار ہے اور ہماری تہذیب اس کی ترجمان، یہ ہماری شعر و شاعری کا بیش بہا سرمایہ ہے۔ اگرا سے گاہے گاہے مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑا، لیکن یہ صنف شعر اپنے خصائص کی وجہ سے ہر دور کے عوام و خواص میں مقبول رہی اور اس کی ہر دلعزیزی میں کوئی فرق نہیں آیا۔''(۱۷)

غزل کے موضوعات

غزل کی ابتدا تو یہیں سے ہوتی ہے کہ عورتوں سے باتیں کرنا یا عورتوں کی باتیں کرنا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب غزل کا آغاز ہوا تو وہ حسن و عشق کی باتوں تک محدود تھی لیکن یہ صورتِ حال زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکی۔ اس کا دامن برابر وسیع ہوتا گیا۔ اب یہ عالم ہے کہ حیات و کائنات کا کوئی موضووع ایسا نہیں جسے غزل نے پیش نہ کیا ہو۔ سید عابد علی عابد لکھتے ہیں:

''غزل بطور ایک کل کے منطقی مفہوم سے بے نیاز ہوتی ہے۔ اس کی متعدد ابیات کا کسی ایک مفہوم کو ادا کرنا استثنا ہے، کلیہ نہیں۔''(۱۸)

شروع شروع میں غزل کی دنیا بہت تنگ تھی۔ غزل کے بڑے شاعر ولی دکنی کے دیوان کا مطالعہ کیا جائے تو سوائے چند اشعار کے باقی یا تو عشق و عاشقی سے متعلق ہیں اور بالکل سطحی قسم کے ہیں۔ چند شعر حقیقی عشق کے ہیں۔ شمالی ہند میں میر تقی میر نے غزل میں سوز و گداز اور تصوف کے مضامین کیے۔ انھوں نے زندگی کے اہم مضامین بھی غزل میں پیش کیے۔ گو ان کی تعداد کم ہے۔

سید عابد علی عابد لکھتے ہیں:

''غزل کچھ ایسی پیچیدہ صنفِ سخن ہے، کہ ایک گرہ کھولیے تو دس گرہیں اور نئی پڑتی ہیں۔''(۱۹)

شمالی ہند کے بعد شاعری کا مرکز لکھنؤ منتقل ہوا۔ یہاں اردو شاعری کو زوال ہوا مگر دو اہم اضافے بھی ہوئے۔ ایک تو یہ کہ مرد کی بجائے عورت کو اردو شاعری کی دنیا میں بازیابی ہوئی اور دوسرا ہجر کی بجائے وصال کے مواقع میسر آئے۔

لکھنؤ شاعری کے بعد غالب کا دور آتا ہے۔ جس میں مومن نے تو غزل کے دائرے کو عشق و عاشقی تک محدود رکھا۔ البتہ غالب نے اس میں فکر کا عنصر داخل کیا اور شاعری کو ذہن دیا۔ اقبال نے غزل کو فلسفیانہ رنگ میں رنگا جبکہ فیض نے سیاسی شاعری کی۔ جدید دور کے شعرا نے غزل میں ہر مضمون اور ہر موضوع پیش کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ غزل کا دائرہ کائنات کی طرح وسیع ہے۔

غزل کے اشعار

غزل کے لیے اشعار کی کوئی بندش نہیں۔ پرانے زمانے میں غزل کے اشعار کی تعداد بالعموم پانچ سے سترہ تک ہوتی تھی۔ پروفیسر انور جمال لکھتے ہیں:

> ''غزل شاعری کا وہ پیکر حسن ہے جس میں پانچ یا زیادہ اشعار ہوتے ہیں۔ رمز، ایما، ایمائیت، سوز و گداز، موسیقیت اور ایجاز اس کے کیفیتی (باطنی) خواص ہیں۔ واردات حسن وعشق، کربِ ذات کا بیان، غم دوراں کا تذکرہ اس کے موضوعات ہیں۔''(۲۰)

غزل کے پہلے شعر میں ردیف اور قافیہ کا التزام کیا جاتا ہے اور پھر ہر شعر کے مصرع ثانی میں مطلع کے ردیف قافیے کی پابندی اس کے خارجی اور ہیئتی اصول ہیں۔ بعض اوقات غزل گو ایک غزل کے بعد اسی بحر اور ردیف قافیہ میں دوسری غزل کہہ لیتا تھا، جسے دوغزلہ کہتے ہیں۔ بعض شعرا نے سہ غزلہ اور چہار غزلہ بھی لکھے ہیں۔ انشا کے ہاں نوغزلہ بھی ملتا ہے لیکن جدید شعرا غزل میں اشعار کی قید کو ایک بے معنی چیز سمجھتے ہیں۔ اختر انصاری لکھتے ہیں:

> ''غزل کے اشعار تعداد کے لحاظ سے طاق ہونے چاہییں نہ کہ جفت۔ اگر کسی غزل میں تعداد اشعار جفت ہوگی تو اسے منجملہ عیوب خیال کیا جائے گا۔ طاق کی شرط اس لیے ہے کہ غزل کے بنیادی مفروضات میں سے ایک مفروضہ یہ ہے کہ شاعر کا محبوب یکتا اور بے مثل ہوتا ہے جس کا دنیا میں کوئی ثانی ممکن نہیں۔ لہٰذا غزل کے اشعار بھی طاق ہونے چاہییں۔ نیز یہ کہ محبوب تک رسائی اور عشق میں کامیابی ایک متعذر الوقوع امر ہے۔ اس لیے غزل میں ہجر و مفارقت ہی کے مضامین ہو سکتے ہیں اور ہجر سے طاق کو زیادہ مناسبت ہے نہ کہ جفت کو۔''(۲۱)

مقبولیت کے اسباب

غزل بنیادی طور پر ایک داخلی صنف ہے اور شاعر وہی بیان کرتا ہے جو اُس کے دل پر بیت رہی ہو حالانکہ یہی کیفیات دوسروں کے دل پر بیت چکی ہوتی ہیں۔ شاعر معاشرے کا سب سے زیادہ حساس فرد ہوتا ہے۔ وہ ان کیفیات کو زیادہ قریب سے محسوس کرتا ہے اور دیکھتا ہے۔ لہٰذا غزل پڑھنے یا سننے والے کو اپنی داستان سنائی دیتی ہے۔ یعنی کہانی میری روداد زمانے کی۔ جو بھی سنتا اُسے اپنی داستان معلوم ہوتی۔ اس طرح غزل آپ بیتی کی بجائے جگ بیتی بن جاتی جو کچھ شاعر کے دل پر گزرتی ہے اس کے لیے تنقید میں مختلف الفاظ موجود ہیں، احساسات، جذبات، واردات، قلبی واردات، تجربہ، شعری تجربہ یا جمالیاتی تجربہ وغیرہ ان کے برعکس غزل کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ جذبات واحساسات کے علاوہ غزل میں فکر کا کو عنصر غالب آ گیا۔ شاعر وہی پیش نہیں کرتا جو وہ سوچتا ہے بلکہ وہ بھی پیش کرتا ہے جو دیکھتا ہے۔ جب شاعر کا خیال یا اس کی فکر جذبہ واحساس بن کر غزل کے شعر میں ڈھل جائے اسے فکر محسوس کہا جاتا ہے۔

غزل کی مقبولیت کا ایک سبب اس کا ایک خاص موضوع عشق ہے۔ عشق ایسا جذبہ ہے جس سے کوئی دل خالی نہیں۔ یوں تو عشق کے ہزاروں روپ ہیں لیکن سب سے ارفع و اعلیٰ وہ عشق ہے جو

بندے کو حقیقی خدا سے ملاتا ہے۔ کوئی دل ایسا نہیں جس میں عشق کا جذبہ نہ ہو۔ جذبہ عشق کی تاثیر مسلم ہے اور غزل آغاز ہی سے اس جذبے کے اظہار کے لیے وقف تھی۔

غزل کی مقبولیت کا ایک اور سبب رمز و ایما کا فن ہے۔ یعنی شاعر کا اشارے کنایے میں باتیں کرنا۔ شاعر ایسا کرنے پر مجبور ہے۔ عام طور پر غزل کا شعر مکمل اکائی ہے۔ شاعر کو اپنا تجربہ اپنی واردات ایک شعر میں سمونی ہوتی ہے۔ کیسا ہی پیچیدہ تجربہ کیوں نہ ہو اس کے اظہار کے لیے شاعر کے پاس دو مصرعوں کا ننھا سا پیمانہ ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ کمالِ فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایسی تدبیریں اختیار کرتا ہے کہ وہ جس تجربے سے دوچار ہے وہ ان دو مصرعوں میں سما جائے۔ اس لیے وہ ایسی تدبیر اختیار کرتا ہے کہ جو بات اشاروں میں کہہ رہا ہے قاری جو غزل کی روایت سے آگاہی رکھتا ہے وہ ان اشاروں کا مطلب خود نکال لیتا ہے۔

غزل کی مقبولیت ایک اہم سبب اس کی غنائیت ہے۔ اگر شعر میں ترنم یا موسیقی نہ ہو تو وہ شعر کہلانے کا مستحق نہیں۔ غزل میں یہ خوبی اتنی زیادہ ہے کہ دوسری کوئی صنف اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ غزل کسی ایک بحر میں ہوتی ہے۔ یعنی ہر مصرعے کا وزن یکساں ہوتا ہے جس سے ایک خاص دھن پیدا ہوتی ہے۔ سید عابد علی عابد لکھتے ہیں کہ موسیقی میں جو کام ضرب کرتی ہے قافیہ وہی کام غزل میں کرتا ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں کہ ردیف غزل کے پاؤں میں پائل یا جھانجھن کا حکم رکھتی ہے۔ یہ اس کی موسیقیت، ترنم اور موزونیت کو بڑھاتی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ غزل کا شاعر لفظوں کے انتخاب اور ان کی ترتیب میں موسیقیت اور ترنم کا خیال رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غزل اچھی طرح سے گائی جا سکتی ہے۔ اس لیے محفلوں، مشاعروں میں غزل بے حد مقبول ہے۔

غزل کی مقبولیت کا ایک اہم راز یہ ہے کہ غزل کے اشعار آسانی سے یاد ہو جاتے ہیں اور مختلف موقعوں پر ان کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ایک شعر میں ایک تجربہ اختصار کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ جب کوئی شخص اس قسم کے تجربے سے دوچار ہوتا ہے۔ وہ آسانی سے اس تجربے کو دہرا سکتا ہے۔ کبھی کبھی تو ایک مصرعے سے بھی یہ کام لیا جا سکتا ہے۔ یہ وہ خوبیاں ہیں جن کی بنا پر غزل باقی اصناف پر چھائی رہی ہے اور آئندہ بھی اس کا مستقبل بہت روشن ہے۔

غزل پر اعتراضات

جب سے اردو میں باقاعدہ تنقید کا آغاز ہوا ہے۔ اس وقت سے غزل پر اعتراضات کی بوچھاڑ ہوتی رہی ہے۔ غزل پر سب سے پہلا اعتراض تو یہ ہے کہ اس کا دامن تنگ ہے اور اس میں سوائے عشق و عاشقی کے کچھ نہیں ہے اور یہ عشق بھی فرضی ہے۔ عشق کی بحث وہ شخص بھی کرتا ہے جس نے کبھی عشق کیا ہی نہیں۔ اس اعتراض کے جواب میں کئی باتیں دلیل کے طور پر پیش کیا جا سکتی ہیں کہ جس زمانے میں حالی نے یہ اعتراض کیا تھا، اُس زمانے سے بھی پہلے غالب جنھیں حالی اپنا استاد تسلیم کرتے تھے، اردو غزل کے موضوعات کو وسعت دے رہے تھے۔ وہ حیات و کائنات کا مشاہدہ کرتے اور انھیں غزل کا

جامہ پہناتے۔حقیقت یہ ہے کہ عشق بھی زندگی کا حصہ ہے اس لیے اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔اہم بات یہ ہے کہ عشق کا دائرہ بہت وسیع ہے۔عشق کی حدود میں مجازی سے لے کر حقیقی تک اور ابتدا سے انتہا تک سب کچھ شامل ہے۔دوسرے الفاظ میں یہ اپنے اندر پوری کائنات کو سمیٹنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔اس کا کینوس بہت وسیع ہے۔

یہ بھی ضروری نہیں کہ جس نے عشق کیا نہیں اُسے اپنے شعروں میں عشق و عاشقی کا ذکر کرنے اور معاملات عشق کو پیش کرنے کا کوئی حق نہیں۔شاعر کے پاس تخیل کی ایسی صلاحیت ہوتی ہے کہ جو کچھ اس نے اصلیت میں نہ دیکھا ہو تخیل کی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے اور جو کچھ شاعر کے دل پر نہیں بیتی وہ تخیل کی بدولت اس کے دل پر بیت جاتی ہے۔شیکسپیئر نے اپنے ڈراموں کی ایسی جیتی جاگتی تصویریں پیش کی ہیں کہ لوگوں کو بے اختیار کہنا پڑا کہ ہمارا شاعر ضرور اٹلی گیا ہے۔سورداش پیدائشی نابینا تھے۔وہ کیسے تصور کر سکتے تھے کہ ان کی شاعری میں جو تصویریں بکھری ہیں وہ اُنھوں نے دیکھ کر نہیں محض سن کر بنائی ہیں۔

غزل پر دوسرا اعتراض یہ تھا کہ اس میں مضامین کی تکرار ہے۔چند مضامین کو لفظوں کے معمولی الٹ پھیر کے ساتھ بار بار پیش کیا جاتا ہے۔اس اعتراض کا جواب یوں دیا جا سکتا ہے کہ ایک ہی مضمون کو کئی دل نشین انداز میں ادا کرنا کوئی عیب نہیں بلکہ ہنر ہے۔اس سے شاعر کے کمال فن کا پتہ چلتا ہے۔

غزل پر ایک اور اعتراض اس کی ریزہ کاری ہے۔ریزہ کاری سے مراد کہ غزل کا ہر شعر ایک مکمل اکائی ہوتا ہے۔یعنی ایک ہی شعر میں پوری بات کہہ دی جاتی ہے۔یعنی غزل کے شعروں میں کوئی ربط نہیں ہوتا۔اگر ایک شعر میں ہجر کی بات ہے تو دوسرے میں وصل کی بات ہو سکتی ہے اور تیسرے میں کوئی اور۔اسی بات پر سب سے زیادہ اعتراض کیا جاتا ہے۔حالانکہ یہ غزل کی سب سے بڑی خوبی ہے کہ ہر شعر میں ایک تجربہ بیان کیا جاتا ہے۔دو مصرعوں کا کوئی تجربہ اسی صورت میں پیش کیا جاتا ہے کہ اشاروں کنایوں میں بات کہہ دی۔اس طرح ابہام پیدا ہوتا ہے جس سے شعر کے حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔

غزل پر ایک اور اعتراض یہ تھا کہ اس میں معشوق امرد یعنی لڑکا ہوتا ہے اور غزل میں زنانہ لباس کے ذکر کو بھی معیوب سمجھا جاتا۔آہستہ آہستہ اس کا رواج بھی ختم ہو گیا۔

غزل کے شاعر کو زیادہ پابندیوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ہر مصرع یکساں وزن میں ہوتا۔قافیہ کی پابندی کرنی پڑتی اور کبھی کبھی قافیے کے علاوہ ردیف کا بھی اہتمام کرنا پڑتا اور یہ بھی ضروری تھا کہ مطلع کے دونوں مصرعوں میں قافیہ یا ردیف و قافیہ دونوں کا انتظام کیا جائے۔آخری شعر جو مقطع کہلاتا ہے اس میں شاعر کو اپنا تخلص لانا ضروری ہوتا ہے۔اس کے علاوہ یہ پابندی کچھ کم نہیں کہ غزل کا شاعر دو مصرعوں میں اپنی بات مکمل کرتا ہے۔اتنی بندشوں کے باوجود اگر شاعر اچھی غزل کہنے پر قدرت رکھتا ہے تو اسے روکنے کا کسی کو حق نہیں۔شاعر خود تکلیفیں اُٹھاتا ہے لیکن سامعین کو بہتر شعروں سے لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ایک انگریزی نقاد کا فرمان ہے کہ شاعری کا معاملہ پڈنگ کا سا ہے۔ہمیں اس کی

لغت سے سروکار ہے اس کے پیچھے جو مشقت ہوئی ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔

ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ غزل کے شاعر کو اُلٹا چلنا پڑتا ہے۔یعنی ردیف پہلے سے طے ہے۔اس سے پہلے قافیہ، پھر قافیے کی رعایت سے دوسرا مصرع پہلے مکمل ہوتا ہے، پھر اس پر گرہ لگائی جاتی ہے، یعنی پہلا مصرع کہا جاتا ہے۔اس طرح غزل کہنے کی ترتیب الٹی ہوئی لیکن یہی شاعر کا کمال ہے کہ وہ دوسرا مصرع پہلے اور پہلا مصرع بعد میں کہتا ہے لیکن پڑھنے والے کو احساس تک نہیں ہوتا۔حقیقت میں یہی فن ہے۔

صنفِ غزل پر کتنے ہی سخت اعتراض کیے گئے مگر ان سب کے مدلل جواب موجود ہیں۔کہتے ہیں ڈان کوئکزو اپنے نیزے سے پون چکیوں پر حملہ آور ہوتا ہے، ان چکیوں کا تو بال بھی بیکا نہ ہوتا تھا مگر اس کا نیزہ ضرور ٹوٹ جاتا تھا۔ان اعتراضات سے غزل کا تو کچھ نہ بگڑا اور یہ اعتراض دلیلوں کے ساتھ رد کیے گئے کہ معترضین کو مجبوراً خاموش ہونا پڑا اور اس کی اہمیت کو تسلیم کرنا پڑا۔

آزاد غزل میں مکمل بحر کے بجائے صرف رکن سے کام لیا گیا ہے۔قافیہ اور ردیف البتہ برقرار رکھا جاتا ہے۔سب سے پہلے بھارت میں آزاد غزل پر تجربہ کیا گیا اور زیادہ تر وہاں کے ناقدین نے اس کے جواز اور عدم جواز پر بحث کی ہے۔ بھارت میں مظہر امام اور دوسرے شعرا میں رفعت سروش، حرمت الاکرام، یوسف جمال ہوشیار پوری ، نازش پرتاب گڑھی، رفعت غوری، زرینہ ثانی، کرشن موہن ، عابد کاشمیری، آزاد گلاٹی، خالد رحیم اور بدیع الزماں خاور شامل ہیں۔ڈاکٹر سلیم اختر ،مظہر امام کے حوالے سے یوں رقم طراز ہیں:

> ''میں نے محسوس کیا کہ اگر آزاد نظم ہی کی طرح آزاد غزل کہی جائے اور مصرعوں میں ارکان کی کمی بیشی روا رکھی جائے تو غیر ضروری الفاظ اور فقروں سے نجات پائی جا سکتی ہے اور خیالات کو وسعت بھی بخشی جا سکتی ہے۔ میں نے غزل کے دوسرے لوازمات اور صنفی خصوصیات پر حرف نہیں آنے دیا چونکہ ارکان کی کمی بیشی سے ہی آزاد نظم کی تشکیل ہوتی تھی۔اس لیے مجھے اس کے مقابل ''آزاد غزل'' ہی مناسب معلوم ہوا۔''(۲۲)

پاکستان میں ڈاکٹر سلیم اختر، قتیل شفائی، ماجد الباقری، سجاد مرزا، محمد اقبال نجمی، قاضی اعجاز محمود اور سعید اقبال سعدی، فیض احمد فیض اور دوسرے اہم شعرا نے آزاد غزلیں لکھی ہیں۔مظہر امام نے اسے ''اچھوت صنفِ سخن'' قرار دیا ہے۔

آزاد غزل تجربہ کی حد تک تو صحیح رہی لیکن ایک باضابطہ تحریک نہ بن سکی۔حالانکہ آزاد غزل گو شعرا میں معروف نام بھی نظر آتے ہیں۔دراصل مروج غزل سے قاری زیادہ مانوس ہیں اور آزاد غزل میں انھیں مروج غزل جیسی رعنائی نظر نہیں آئی۔یہی وجہ ہے کہ آزاد اگر بے معنی نہیں تو بے نمک ضرور ہے۔شاعری میں فن کمال یہ ہے کہ صنف کی حدود قیود میں رہتے ہوئے کی جائے نہ کہ پابندیاں توڑ کر۔

غزل کا مستقبل

زمانہ بہت تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے ان مسلمات کی حیثیت کو محض فسانہ قرار دے دیا ہے جنھیں صدیوں سے اجتماعی انسانی ذہنوں کا اعتماد حاصل تھا۔ ایسی تمام باتیں جو وہم و گمان اور شک کی بنا پر کی جاتی تھیں۔ سب کو ختم کر دیا۔ تحقیق کے بعد شک و شبہ سے وابستہ خیالات حقیقت کا روپ دھار چکے ہیں۔ دنیا سمٹ کر ایک Global Village بن گئی ہے۔ ناممکن ممکن ہوتے جا رہے ہیں۔ انقلابات کی زد میں آ کر فکر و نظر کی دنیائیں نئے میدانوں میں سرگرمِ عمل دکھائی دی رہی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ سائنس کی ایجادات اور انکشافات نے باثروت بنا دیا ہے اور اس کے دائرۂ عمل میں وسعت پیدا کی ہے۔ اس کا منفی پہلو یہ ہے کہ اس نے انسان کو بے یقینی کی کیفیت سے دوچار کیا ہے۔ فکر و نظر کے تمام گوشوں پر تشکیک کا سایہ منڈلا رہا ہے۔ اس ہچکولے کھاتی کیفیت میں لمحہ موجود کے حوالے سے کچھ کہنا مشکل ہے تو مستقبل کے لیے پیش گوئی خوش فہمی کے سوا کچھ نہیں اور پھر ادب کی اہم ترین صنف غزل کے بارے میں قیاس آرائی اور بھی مشکل کام ہے۔ ادبی حلقے میں کسی بھی صنف کو موضوعِ بحث بناتے ہوئے اس کے روشن اور تاریک دونوں پہلوؤں کو مدِنظر رکھا جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ آج جس صنف کے مستقبل کے حوالے سے اندازے قائم کر رہے ہیں، کل کو وہ صنف باقی نہ رہے اور ہمارے سارے اندازے دھرے کے دھرے رہ جائیں لیکن اس طرح موجود کا تابع بن کر ناموجود سے اپنے آپ کو الگ کرنے کے مترادف ہے۔ یہیں سے سائنس اور ادب کی راہیں الگ ہو جاتی ہیں۔ ادب ''موجودات'' کا تابع نہیں۔ یہ ''موجود'' سے ''ناموجود'' اور ''دیدہ'' سے ''نادیدہ'' جہانوں کی سمت سفر کرتا ہے۔ تخیل اس کی روح ہے۔

فارسی اور اردو ادبیات کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اصنافِ سخن میں غزل ہی واحد صنف ہے۔ مسلسل تنقید کا سامنا کرنے کے باوجود اپنے تشخص کو برقرار رکھا، سخت سے سخت امتحان سے سرخرو ہو کر زمانے کے بدلتے ہوئے رنگوں کے مطابق نئی صورتوں کو قبول کیا لیکن یہ نئی صورتیں اس کے معیارات سے متصادم نہیں کیونکہ غزل ایسی صورتوں کو قبول نہیں کرتی جو اس کے معیارات سے ہم آہنگ نہ ہو۔ یہی وجہ ہے اس نے ہمیشہ کانٹوں سے دامن بچائے ہوئے اپنے لیے پھولوں کا انتخاب کیا ہے۔ مثال کے طور پر جب ریختی گوؤں نے غزل پر مسلط ہونے کی کوشش کی۔ غزل نے اپنے معیارات کا دفاع کرتے ہوئے اس رنگ کو قبول نہ کیا۔ جب ایہام گوؤں نے اس کو لفظوں کے دھندے میں الجھانے کی کوشش کی اور ایہام کو اس کی شناخت قرار دینا چاہا، غزل نے اس رنگ کو قبول نہ کیا کیونکہ یہ اس کے معیارات کے خلاف تھی بعض مقامات پر غزل ایسے رجحانات کی لپیٹ میں آئی لیکن جلد ہی چھٹکارہ حاصل کر کے اپنے روایتی جادہ پر گامزن ہوگئی۔ پروفیسر سید محمد عقیل لکھتے ہیں:

> ''ہنگامیت کبھی غزل کو باندھ نہیں سکی اور جو غزل ہنگامیت کے ساتھ چلی وہ وقت کے ساتھ وہیں چھوٹ گئی اور غزل اس ہنگامیت کا بھی عطر لے کر پھر اپنی روایت کے کارواں میں

شامل ہو جاتی ہے۔ اس روایت کا کارواں، دل کی منزل کی تلاش میں آج بھی سرگرم رفتار ہے۔ غزل میں سے اگر ''جنون صفاتی''، ختم ہو گئی تو پھر اس کے پاس کیا رہ جائے گا۔''(۲۳)

غزل کے طویل سفر پر نگاہ ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ غزل ایسی صنفِ سخن ہے جو بہ یک وقت لچک بھی رکھتی ہے اور شدت بھی۔ یہ دونوں حالتیں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ تاہم غزل کا مزاج ان دونوں صورتوں کے ارتباط سے عبارت ہے۔ غزل نے نئے زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے اور اپنے دائرے کو وسیع کرنے کے لیے ہمیشہ نئی صورتوں کے لیے اپنے دروازے کھلے رکھے ہیں۔ اس سے اس کی (Flexibility) کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنے معیارات پر سختی سے عمل کر رہی ہے۔ یہ رویہ اس کی شدت اور سختی کو ظاہر کرتا ہے کیونکہ ان دونوں رویوں کو مدِ نظر رکھے بغیر اس کے مزاج کو مکمل طور پر سمجھنا مشکل ہے اور وہ تجربات کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے جن میں اس کی لچک اور شدت کو نظر انداز کیا گیا ہو۔

غزل کے روشن ماضی اور درخشاں حال کو سامنے رکھتے ہوئے اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ اگر غزل بطور صنف زندہ رہی تو اس کا مستقبل بھی روشن ہوگا۔ اس کے زندہ رہنے کا امکان بہت واضح ہے کہ اس کی صنفی خصوصیات میں ایسے امکانات موجود ہیں جو آئندہ زمانوں میں اس کے وجود کو باقی رکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ غزل کی ایک اہم خصوصیت اس کا ایجاز و اختصار ہے۔ آئندہ زمانے میں فرصت و فراغت کا ماحول عنقا ہو جائے گا۔ تخلیق کار نظم کے طویل سانچوں کا انتخاب کرنے کی بجائے ایسی ہیئت کا انتخاب کریں گے جس کے ذریعے کم سے کم وقت میں تخلیقی عمل مکمل ہو جائے اور غزل کی ہیئت آئندہ زمانے کی برق رفتاری کا ساتھ دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

غزل کی امتیازی خصوصیت اس کے معیارات کے باعث ہے۔ ان معیارات کے تحفظ ہی میں اس کی حیات و بقا پوشیدہ ہے۔ موجودہ دور میں کچھ ایسے عوامل کارفرما دکھائی دے رہے ہیں جو موجودگی غزل کے معیارت کے لیے کسی طرح بھی مفید نہیں اور خدشہ ہے کہ منفی عوامل اگر اسی طرح سرگرم سفر رہے تو غزل اپنے معیارات کا دفاع کرنے میں ناکام ہو جائے گی اور اس کے مستقبل کی تابنا کی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا۔ مثلاً ہر روز غزل کے کئی نمونے شائع ہو رہے ہیں جن کا معیار انتہائی پست ہے اور ادبی رسائل، اخبارات و جرائد میں غزل کے نام پر جو تخلیقات شائع ہو رہی ہیں۔ یہ زندہ رہنے کی صلاحیت سے محروم ہیں۔ اسی طرح مشاعرے کی روایت اور اصلاح کا نظام قریب قریب دم توڑ رہا ہے۔ غزل کے معیارات کو برقرار رکھنے میں ان اداروں کا کردار انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ ایک اہم مسئلہ تو مطالعہ کا رجحان دن بدن کم ہو رہا ہے۔ موجودہ دور کے اکثر شعرا مطالعے کی کمی کے باعث موضوعات کی تنگ دامانی، مواد کی بے ترتیبی اور زبان و بیان کی غلطیوں کا شکار ہیں۔ اسی طرح غزل کی ہیئت میں جو تجربے کیے جا رہے ہیں۔ وہ غزل کے معیارات سے متصادم ہیں۔ آزاد غزل، معرا غزل اور نثری غزل ہیئت برائے ہیئت کا نتیجہ ہیں جو زیادہ

دیر تک قائم نہیں رہ سکیں گے۔ ہیئت شکنی کا یہ رویہ غزل کی شناخت کو مٹانے کے درپے ہے۔

یہ منفی عوامل اگرچہ پریشان کن صورتِ حال کی عکاسی کرتے ہیں۔ تاہم غزل ایسی سرد و گرم چشیدہ صنفِ سخن ہے جو زوال اور ادبار کی فضا میں زیادہ توانائی کے ساتھ ابھر کر سامنے آتی ہے۔ تنگ و تاریک راستے اور ناقابل عبور گھاٹیاں اس کی رفتار میں کمی نہیں کر سکتے۔ ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

> ''انھوں نے غزل کو لوہے کے سپرنگ سے تشبیہ دی ہے جس طرح سپرنگ دباؤ سے سکڑ جاتا ہے اور دباؤ ہٹنے سے اپنی اصلی جگہ پر آ جاتا ہے، اسی طرح غزل منفی عوامل کے دباؤ سے وقتی طور پر دب جاتی ہے مگر جیسے ہی اس دباؤ کی گرفت ڈھیلی پڑتی ہے، غزل اپنی اصل صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ عہد موجود کے منفی عوامل کا دباؤ بھی غزل کی صورت اصلی کو بگاڑ نہ سکے گا اور غزل اسی طرح فتح وظفر کے پھریرے لہراتی اگلی منزلوں کی طرف رواں دواں رہے گی۔''(۲۴)

اکیسویں صدی کے آغاز ہی سے کچھ ایسے ستارے چمکتے دکھائی دے رہے ہیں جو غزل کے امکانات کی بشارتوں سے معمور ہیں۔ ان کے آئینے میں غزل کی آئندہ سفر کی تاب پوری طرح جھلکتی نظر آتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، غزل اردو کی شعری روایت، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص: ۱۱
۲۔ رفیع الدین ہاشمی، اصناف ادب، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء، ص: ۳۱
۳۔ سرور، آل احمد، پروفیسر، مجموعہ تنقیدات، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء، ص: ۳۸
۴۔ اختر انصاری، غزل کی سرگزشت، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۸۵ء، ص: ۹
۵۔ تاباں، غلام ربانی، حدیث دل، دہلی: اردو رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، ۱۹۶۰ء، ص: ۸
۶۔ سلام سندیلوی، ادب کا تنقیدی مطالعہ، لاہور: میری لائبریری، ۱۹۶۳ء، ص: ۵۷
۷۔ ولی دکنی، کلیات ولی، مرتبہ: نورالحسن ہاشمی، لاہور: وقار پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء، ص: ۹۷
۸۔ میر، میر تقی، کلیات میر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء، ص: ۴۳
۹۔ اسداللہ خاں غالب، مرزا، دیوان غالب، لاہور: امتیاز گھر، ۱۹۹۹ء، ص: ۹۸
۱۰۔ میر، میر تقی، کلیات میر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص: ۳۷۰
۱۱۔ نورالحسن ہاشمی، دہلی کا دبستان شاعری، لاہور: شرکت پرنٹنگ پریس، ۱۹۹۱ء، ص: ۲۷
۱۲۔ آتش، حیدر علی، خواجہ، دیوان آتش، مرتبہ: شیما مجید، لاہور: مکتبہ عالیہ، ۲۰۰۷ء، ص: ۹۷
۱۳۔ حسرت موہانی، کلیات حسرت، لاہور: خزینہ علم وادب، ۲۰۰۴ء، ص: ۱۷۹
۱۴۔ قاسم، غفور شاہ، پاکستانی ادب (شناخت کی نصف صدی)، راولپنڈی: ریز پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء، ص: ۵۰
۱۵۔ ناشاد، ارشد محمود، ڈاکٹر، اردو غزل کا تکنیکی، ہیئتی اور عروضی سفر، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۸ء، ص: ۳۳۰
۱۶۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، تنقیدی زاویے، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۵۱ء، ص: ۱۱۴
۱۷۔ قاسم جلال، ادبی تجربے، بہاولپور: ثانی پرنٹنگ پریس، ۱۹۹۹ء، ص: ۱۴
۱۸۔ عابد، عابد علی، سید، اصول انتقادیات، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۳ء، ص: ۲۸۰
۱۹۔ عابد، عابد علی، سید، مقالاتِ عابد، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء، ص: ۲۳
۲۰۔ انور جمال، ادبی اصطلاحات، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۰ء، ص: ۸۰
۲۱۔ اختر انصاری، غزل کی سرگزشت، ص: ۱۱
۲۲۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، تنقیدی اصطلاحات، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ص: ۱۶
۲۳۔ محمد عقیل، سید، پروفیسر، غزل کے نئے جہات، دہلی: مکتبہ جدید، ۱۹۷۲ء، ص: ۱۵۷
۲۴۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، نئے مقالات، سرگودھا: مکتبہ زبان ادب، ۱۹۷۲ء، ص: ۱۵۷